Date of Publication: 09-09-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 Sep. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 September 2013 — ۱۵ تا ۲۱ ستمبر ۲۰۱۳ء

Issue: 35, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۳۵، جلد نمبر: ۷۲

انجمن ترقی اردو (ہند): نئے امکانات کی پیہم جستجو

اطہر فاروقی

۱۸۸۶ میں سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے جو تنظیم قائم کی تھی اس کے نتیجے میں آگے چل کر ۱۹۰۳ میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کے دور رس مقاصد کے مطابق انجمن کے قیام کا مقصد خصوصاً مسلمانوں کو نئے نظام سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندی کے نام پر ہندو نیشنلزم کی سیاست زور پکڑ چکی تھی اور اردو-ہندی تنازعے کے نتیجے میں اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان کے طور پر جانی جانے لگی تھیں۔ اردو ہندی تنازعے میں سرسید اور ان کے رفقا پہلے ہی سے اردو کے ساتھ تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سرسید کے مشن کا حصہ تھا۔ یہ بات اردو کی سیاست اور اس کے مسلم تشخص پر علمی کام کرنے والوں کے لیے حیرت کی باعث نہ سہی مگر خاصی دل چسپی کی حامل ضرور ہے۔ یہ بات مگر ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس وقت مسلم نیشنلسٹ سیاست کا وجود نہ تھا اور بیسویں صدی میں جب مسلم نیشنلسٹ سیاسین اور دانش وروں کی کہکشاں نے قومی منظرنامے کو فیصلہ کن انداز میں متاثر کرنا شروع کیا تو نہ صرف مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے جید مسلم نیشنلسٹ اکابر نے انجمن ترقی اردو کے خلیقے کو متاثر کیا بلکہ غیر مسلم اہل قلم کی کہکشاں بھی انجمن کے عمائدین میں ایسی شامل ہوئی کہ آج اگر ہندستان میں انجمن اپنے ہندستانی خلیقے کے ساتھ موجود ہے اور اس پر کسی طرح بھی فرقہ پرست مسلم سیاست کا لیبل چسپاں نہیں ہوا تو اس کا بہت کچھ کریڈٹ انجمن کے غیر مسلم عمائدین کو بھی جاتا ہے جن میں ہردے ناتھ کنزرو، سرتیج بہادر سپرو، برج موہن دتاتریہ کیفی اور بعد کے آنے والوں میں آنند نرائن ملا اور مالک رام جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ یہ خوش گوار سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ تقسیم سے پہلے انجمن کے معاملات میں گاندھی جی کی گہری دل چسپی اور تقسیم کے بعد ان کے سیاسی وارث جواہر لال نہرو کی سرپرستی نے انجمن کو ہر بلا سے محفوظ رکھا۔

یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ نہرو کی سیاست ان معنوں میں گاندھی جی سے بہت مختلف تھی کہ وہ سیاست میں مذہب کی آمیزش کو زہر سمجھتے تھے۔ مذہب کے تعلق سے اگر نہرو کے سیاسی مقاصد گاندھی جی سے اس قدر مختلف نہ ہوتے تو آج ہندستان کی تصویر اتنی خوش نما نہ ہوتی۔

تقسیم ہند، جو یہاں کی اقوام اور سیاسیوں کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا، اس نے ہندستان میں اردو کی صورت حال کو سیاسی اور سماجی دونوں ہی سطحوں پر منفی انداز میں متاثر کیا اور تقسیم سے انجمن کے وجود پر لگے زخموں پر قابو پانے میں اس قوم پرست ادارے کو تیس برس لگ گئے۔ دلی میں اردو گھر کی تعمیر کا عمل ہوا انجمن ترقی اردو (ہند)، جو تقسیم کے بعد ہندستان میں اردو کی واحد نمائندہ تنظیم تھی اور خود اردو زبان کے لیے ایک نئی زندگی کے آغاز سے عبارت کہا جا سکتا ہے۔ دلی میں مرکزی حیثیت کے حامل علاقے میں اردو گھر کی موجودگی قومی زندگی میں اردو کے وجود کی طاقت ور علامت بن گئی۔ اردو گھر نے اردو کی تحریک کے منقطع سلسلوں کو استوار کیا جس کے نتیجے میں ملک کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی انجمن کی شاخوں میں بھی حرکت اور عمل کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ان میں سب سے فعال اور قابل ذکر بہار کی انجمن ہے جس نے عوامی سطح پر اپنی جڑوں کو اتنا مضبوط کر لیا کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ صوبائی حکومت کو دینا پڑا۔

1989 کے بعد قومی سیاست کے مزاج میں زبردست تبدیلی منڈل کمیشن کی سفارشات کے نفاذ سے ہوئی جس نے ہندستانی زبانوں کے فروغ و ارتقا کے ایجنڈے کو ہمیشہ کے لیے پس پشت ڈال دیا۔ 1991 میں لبرلائزیشن نے نہرو کے سوشلسٹ سیاسی ایجنڈے کو دفن کر کے نئی معاشی پالیسیوں کی بنیاد بالکل ایسے ہی بغیر کسی تیاری کے رکھی جیسے بغیر انجام کی پروا کیے مفاد پرست سیاست نے انسانوں کو تقسیم ہندستان کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ لبرلائزیشن کے اس سرمایہ دارانہ ماڈل کے بارے میں خود اس کے حامی اس امر پر متفق ہیں کہ اس میں حاشیے پر بیٹھے ہوئے لوگ کمزور تر ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارا قومی تجربہ یہ ہے کہ اس لبرلائزیشن نے زبانوں کے تعلق سے جس رجحان کو برق رفتار ترقی دی اس میں ہندستان کی تمام زبانوں کی ترقی اور ترقی کے لیے جدوجہد کے روایتی ماڈل زیب طاق نسیاں ہو گئے اور انگریزی کی تعلیم ہی نہیں ثقافتی سطح پر بھی اس نے جس طرح فروغ پایا اس نے ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں صرف ان مٹھی بھر لوگوں کے کلچر کو مزید فروغ دیا جو انگریزی کے باب میں پہلے ہی مقتدر تھے۔ قومی اور صوبائی سطح پر حکومتوں کی ترجیحات ہندستان کی تمام ہی زبانوں کے ذیل میں تبدیل ہو گئیں اور انھوں نے زبانوں کے فروغ کو کلچر سے جوڑ کر زبانوں کے ہمہ جہتی فروغ کے بجائے ان زبانوں سے وابستہ کلچر کے فروغ کو ترجیح دینے کا لائحہ عمل اختیار کر لیا۔ زبانوں کی جگہ صرف ان کے کلچر کا فروغ اور وہ بھی کلچر کے مبہم تصور کے ساتھ حکومت کی کم سے کم توجہ اور تقریباً نا کے برابر وسائل کا خواہاں تھا۔ اردو پر اس پالیسی کے منفی اثرات یہ ہوئے کہ اردو تعلیم کے ان امور سے حکومت کی توجہ مکمل طور پر ہٹ گئی جو ہندستان جیسے غریب ملک میں حکومت کی توجہ کے بغیر فروغ پا ہی نہیں سکتے تھے۔

1991 کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کے نظام کا شیرازہ ان علاقوں میں بھی بکھر گیا جہاں تقسیم ہند کے منفی اثرات اثر انداز نہ ہو سکے تھے۔ سامنے کی مثال دلی کے اسکولی نظام کی ہے جہاں اب حکومت کی تمام تر توجہ اردو ثقافت کے مبہم فروغ پر مرکوز ہے جس کے لیے کم سے کم وسائل اور زیادہ سے زیادہ زبانی جمع خرچ کر کے حکومت گذشتہ بیس برسوں سے کام چلا رہی ہے۔ مرکزی انجمن نے ہر موقعے پر ملک بھر میں اردو اسکولوں کے بدتر ہوتے نظام میں بہتری کی ہر ممکن کوشش کی جو آج بھی جاری ہے۔ مگر تبدیل شدہ حالات میں انجمن ترقی اردو کے سربراہان کے سامنے بھی سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ لبرلائزیشن کی پالیسیوں نے اردو زبان کے فروغ اور اردو تعلیم کو جس طرح حاشیے پر پہنچا دیا ہے اور اردو تحریک جس طرح بے جان ہو کر رہ گئی ہے، اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے اس بین الاقوامی سیمینار کے شرکا اس اہم ترین سوال پر انجمن کی رہ نمائی کریں گے۔ اردو زبان اور اس کی تعلیم کی طرف مکمل بے توجہی کی حکومت کی پالیسی انجمن ہی نہیں ان تمام اردو اداروں کی بقا سے اس لیے جڑی ہوئی ہے کہ یہ آج نہ سہی کل ان اداروں کے وجود کا خاتمہ بھی کر دے گی کہ پانی پر کھینچی ہوئی لکیر اگلے ہی لمحے فنا ہو جاتی ہے۔ انجمن کے برعکس، ان اداروں کی عمر بہت کم ہے اور یہ ادارے اردو تحریک کے ذریعے عوام سے بھی وابستہ بھی نہیں رہے۔ عوام کی ان اداروں کے ساتھ انجمن جیسی جذباتی وابستگی بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اردو زبان کے ہمہ جہتی فروغ اور اردو تعلیم کے آخری سانسیں لیتے نظام کو زندگی بخشنے کی کوشش کو اردو کے تمام اداروں کی پالیسی میں مرکزی اہمیت کا حامل ہونا چاہیے۔

(نوٹ: یہ مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ (۳-۵ ستمبر ۲۰۱۳) بین الاقوامی سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں پڑھا تھا۔ ادارہ)

○○○

جذبی صدی پر خراج عقیدت

دوسری اور آخری قسط

ہم قدم جذبی صاحب کی یاد میں

مظفر حسین سیّد (۲۹۱۱- سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲)

جذبی صاحب کے علاوہ بھی ہم نے متعدد اساتذہ سے علمی استفادہ کیا، جن میں قابلِ ذکر ہیں ہاشم قدوائی صاحب، سلامت اللہ خاں صاحب، اشتیاق عابدی صاحب اور اقبال حسن صاحب اور سرِفہرست ہیں قاضی عبدالستار صاحب، جو ہمارے استاد گرامی ہیں۔ تاہم جذبی صاحب کا معاملہ ان سب سے مختلف نوعیت کا تھا جو اپنی جگہ یادگار ہے۔ ایک عجیب و غریب بات تھی کہ جذبی صاحب شعرا کا ذکر تو کرتے تھے، مجاز کے علاوہ جوش، فیض اور فراق کا، کبھی اپنے استاد فانی کو یاد کرتے اور کبھی اپنے محسن میکش اکبرآبادی کو بھی۔ مگر ان کی گفتگو کا موضوع شعری ادب بہت کم ہوتا تھا، ان کے درس ہمیشہ افسانوی ادب کو محیط ہوتے تھے، بالخصوص عالمی ادب۔ ان کے پسندیدہ فن کار تالستائے، گورکی، چیخوف اور موپساں تھے، انھوں نے ان تمام مشاہیر کی تخلیقات کو پڑھ نہیں رکھا تھا، پی رکھا تھا، وہ ان کے فن پر بڑی تفصیل سے، بڑی گہرائی سے بات کرتے، ان کی عظمت کا اعتراف کرتے اور اکثر فرماتے کہ یہ اردو، ہندی والے کیا لکھیں گے، مغربی فن کار پہلے ہی سب کچھ لکھ چکے اور انسانی حیات، کردار، مزاج اور فطرت کے ایسے ایسے پہلو اجاگر کر چکے کہ اب کچھ بچا نہیں ہے۔ البتہ وہ اردو میں داستانوں کے بڑے زبردست مداح تھے، تمام تر داستانیں بارہا پڑھ چکے تھے۔ ایک بار ہماری ملاقات کتب خانہ آزاد کے شعبۂ اردو میں ہوئی، ہم بہ ناکس کسی فراق میں تھے، لیکن ہم نے دیکھا کہ جذبی صاحب داستانوں سے معمور ایک بڑی سی الماری سے نبرد آزما تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور پوچھا "تم داستانیں پڑھتے ہو"۔ ہم نے بتایا کہ فلاں فلاں پڑھ لی ہیں اور فلاں فلاں ابھی ارادے کی منزل میں ہیں۔ ہماری بات سن کر خوش ہوئے اور فرمایا "داستان پڑھنا آسان نہیں۔ ایک تو زرد کاغذ اور پھر ضخامت بے پناہ۔ ایک ایک داستان کی سات سات بلکہ نو نو جلدیں ہیں، وہ بھی جہازی سائز میں، پڑھتے پڑھتے چشمہ لگ جاتا ہے۔ عدسوں کا نمبر بدل جاتا ہے۔ مگر داستانیں پڑھنا ضروری ہے، اردو کا بیش قیمت اور اصلی سرمایہ انھی میں ہے"۔ داستانیں دکھاتے دکھاتے اُن کا رخ بدلا اور کلاسیکی شاعری کی طرف آ گئے۔ انھوں نے ہمیں میر کی کلیات دکھائی، جو کسی داستان کی طرح ضخیم تھی، پھر دیوان غالب سے گزرتے، ذوق اور داغ کو مس کرتے اقبال تک پہنچ گئے، اقبال سے نچلے خانے میں جوش کے ہمسایہ جذبی صاحب کے دونوں مجموعے رونق افروز تھے، ہم نے ادب سے اٹھائے اور عندیہ ظاہر کیا کہ آج انھیں مندرج کرا کر اپنے کمرے پر لے جائیں گے۔ "ارے، یہ تمھارے پاس نہیں، تم نے پڑھے تو ہیں"؟ ہم نے جواباً عرض کیا کہ ہم نے پڑھے تو دونوں ہیں، کسی استاد سے مستعار لے کر، لیکن ہمارے پاس ہیں نہیں۔ بس پھر جذبی صاحب مہربان ہو گئے، جوش کا ایک مجموعۂ کلام ہمیں اپنے نام میں درج کرا کر دیا اور بولے "اپنے دونوں مجموعے ہم تمھیں دیں گے"۔ دراصل اس وقت تک ان کے دو مجموعہ ہائے کلام 'فروزاں' اور 'سخن مختصر' ہی شائع ہوئے تھے، 'گدازِ شب' بہت بعد میں آیا اور 'کلیاتِ جذبی' تو ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوگی۔

اس دن شام کو ہماری چاندی ہوگئی۔ ہم جذبی صاحب کے دولت کدے پر گئے تو پُرتکلف چائے کے ساتھ انھوں نے اپنے دونوں مجموعے دستخط شدہ عنایت فرمائے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ پھر پوچھنے لگے کہ جوش کا کلام پڑھا؟ ہم نے کہا کہ بس ایک نظم پڑھ سکے، پھر یہاں چلے آئے۔ "اچھا، مگر پورا پڑھنا، کہیں اٹکو تو مجھ سے پوچھ لینا۔ جوش قدرے مشکل پسند تو ہے مگر زبان کا بادشاہ ہے، تراکیب اور تشبیہات اس کے ہاتھ کے کھلونے ہیں"۔ دراصل جذبی صاحب جوش کے بڑے مداح تھے، ہم نے مجاز کے بعد ان کی زبان سے سب سے زیادہ ذکر جوش کا ہی سنا۔ وہ جوش کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے، وہ اس بات سے بہت جزبز ہوتے تھے، کہ فیض احمد فیض اور ان کے حواری جوش کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، انھوں نے ہمیں بتایا کہ ایک مرتبہ انھوں نے ترقی پسندوں کی کسی تقریب میں برسرِ محفل کہہ دیا تھا کہ "ہم سب ترقی پسند شاعر ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو جائیں، تب بھی ہمارا اجتماعی قد جوش کے انفرادی قد سے بلند نہیں ہو سکتا، ہم بونے ہی رہیں گے"۔

جذبی صاحب نے ہمارا حوصلہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہم اکثر شام کو ان کے دولت کدے پر بھی جا دھمکتے تھے، ان کی سیر کے وقت سے عین پہلے، وہاں چائے بھی ملتی اور دانے بھی۔ اور اس کے بعد ہم قدمی کا سلسلہ۔ جذبی صاحب کے فرزند ارجمند سہیل احسن ہمارے دوست تھے اور ان دونوں چھپکے چھپکے شاعری کرتے تھے، تاہم ان کی سخن آرائی کی اطلاع پوری یونیورسٹی کو تھی، ماسوا ان کے والدِ محترم جذبی صاحب کے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہم جب بھی جذبی صاحب سے ملنے جاتے تو سہیل بھی ہماری محفل میں شریک نہیں ہوتے تھے، ان سے ہماری ملاقاتیں تو بازار شمشاد کے چائے خانوں میں ہوتی تھیں اور وہاں سنجیدگی کا رواج شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

جذبی صاحب سے ہماری 'ہم قدمانہ' ملاقاتوں کے علاوہ دوسری نوعیت کی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں، ان کے دولت کدے کے علاوہ نجی محفلوں میں، کسی چائے خانے میں اور کتب خانوں میں۔ یہ اُن کی قلندرانہ شان تھی کہ وہ ہماری خاطر کہیں بھی بیٹھ جاتے، چائے پیتے، بلکہ پلاتے۔ جگہ کیسی ہی غیر معیاری ہو، گفتگو ہمیشہ معیاری ہوتی تھی۔ اکثر ہم دیکھتے کہ ان کی قیام گاہ پر یا کہیں اور بھی کوئی نوجوان آتا، ان سے چند لمحے بات کرتا اور رخصت ہو جاتا۔ یہ ان کے ملاقاتی نہیں تھے بلکہ ان کے چہرے شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے، ہم نے تفتیش کی تو انکشاف ہوا کہ یہ سب وہ غریب اور نادار طالب علم تھے جن کی مدد اور کفالت جذبی صاحب بڑی خاموشی اور رازداری سے کرتے تھے اور ہم نے اس مردِ قلندر کی زبان سے اس ضمن میں کبھی اشارتاً بھی کچھ نہیں سنا۔ یہ علی گڑھ کی روایت تھی، وہاں کے استادوں کی شان تھی، لیکن اب یہ سب محض قصۂ پارینہ ہے۔

جذبی صاحب باضابطہ ادبی جلسے جلوس سے دور ہی رہتے تھے، حتیٰ کہ مخصوص نشستوں سے بھی حتی الامکان پہلوتہی کرتے تھے، ہم اپنے دور کے کامیاب محفل بازوں میں شمار تھے اور بڑے ماہر بزم آرا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی محفلوں میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے، لیکن ہمارے ساتھ اپنی تمام تر محبت، الفت اور عنایت کے باوجود جذبی صاحب ہماری برپا کی ہوئی کسی شعری محفل میں جلوہ افروز نہیں ہوتے تھے۔ ہاں، ہم نے ایک مرتبہ انھیں اپنی اس عزلت نشینی کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہ بھی ایک مثال تھی۔ یہ قصہ دورِ خسروی کا ہے۔ خسرو صاحب خوش خلقی، خوش لباسی، خوش خرامی اور خوش گفتاری میں اپنی مثال آپ تھے، ان کا ادبی ذوق بہت گہرا تھا اور شعری مذاق رچا ہوا تھا، بات بات پر شعر سناتے اور اچھے شعر پر سر دھنتے تھے، اس خاکسار کو یہ افتخار حاصل تھا کہ اس کے سنائے ہوئے اکثر شعر وہ لکھوا کر جیب میں رکھ لیتے تھے اور بعد میں ان اشعار کو دیگر محفلوں میں برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کی شریکِ حیات طیبہ خسرو بھی ادب شناس اور ادیب و شاعر نواز تھیں، اسی ذیل میں ہم ان کے یہاں باریاب تھے اور انھیں طیبہ آپا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی رہائش گاہ، یعنی وائس چانسلر لاج پر ایک شاندار شعری محفل منعقد کی، یونیورسٹی کے تمام شعرا اور چیدہ اساتذہ کو مدعو کیا گیا، تقریباً تمام تر شعرائے عظام نے دعوت قبول کرلی اور مع کلام بلاغت نظام شرکت کا وعدہ کرلیا، مگر ایک

جذبی صاحب سے ہماری 'ہم قدمانہ' ملاقاتوں کے علاوہ دوسری نوعیت کی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں، ان کے دولت کدے کے علاوہ نجی محفلوں میں، کسی چائے خانے میں اور کتب خانوں میں۔ یہ اُن کی قلندرانہ شان تھی کہ وہ ہماری خاطر کہیں بھی بیٹھ جاتے، چائے پیتے، بلکہ پلاتے۔ جگہ کیسی ہی غیر معیاری ہو، گفتگو ہمیشہ معیاری ہوتی تھی۔

مرد آزاد یعنی جذبی صاحب نے آنے کی حامی نہیں بھری اور طیبہ آپا کے فرستادہ قاصدوں کو ٹرخاتے رہے۔ جذبی صاحب علی گڑھ کے سب سے قد آور شاعر تھے اور ان کی شرکت کے بغیر کوئی بڑی شعری محفل وقار اور استناد حاصل نہیں کر سکتی تھی، اس لیے ان کی آمد ضروری تھی۔

اب یہ مہم خواں سر کرنے کی ذمہ داری ہمارے سر ڈالی گئی۔ پورے معاشرے کو معلوم تھا کہ ہم جذبی صاحب کی بارگاہ میں باریاب بھی ہیں اور بے باک بھی۔ خیر ہم نے ڈرتے ڈرتے بیڑا اٹھایا اور حاضر ہو گئے ان کے در پر۔ جذبی صاحب حسب عادت مسکرائے اور ہماری استدعا سن کر فرمایا ''تم جانتے ہو میں عام طور پر مشاعروں میں نہیں جاتا اور سرکاری مشاعروں میں تو بالکل نہیں''۔ ہم نے کہا کہ ''طیبہ خسرو کا معاملہ مختلف ہے، وہ آپ کی مداح ہیں اور خسرو صاحب بھی ادب نواز ہیں، ہمارے خیال میں آپ کو کلفت نہیں ہوگی''۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری خاطر جذبی صاحب نے اپنا اصول توڑا اور اس بزم شعر و سخن میں شامل ہوئے۔ ہمارے ہی اصرار پر ہمارے استاد محترم قاضی عبدالستار صاحب بھی شاعری سے اپنے تمام تر انقباض کے باوصف اس محفل میں تشریف لائے سامع کی حیثیت سے۔ محفل کیا تھی، ایک ادبی کہکشاں تھی، کوئی بیس بائیس شاعر تھے۔ علی محمد خسرو صاحب میزبان خصوصی تھے اور آل احمد سرور صاحب صدر محفل۔ جذبی صاحب نے اپنی نئی غزل سنائی اور داد بھی بے حساب وصول کی۔ اگر چہ وہاں ہر دل عزیز اور مقبول شعرا بشیر بدر اور شہر یار بھی موجود تھے۔ جذبی صاحب کے بعد صدر محترم کا نام پکارا گیا، نظامت غالباً نسیم قریشی مرحوم کر رہے تھے۔ سرور صاحب مائک پر آئے تو عقبی نشست سے کسی نے کہا کہ اب استاد کی باری ہے۔ کبھی قاضی صاحب نے برجستہ اور بہ آواز بلند کہا کہ ''استاد تو پڑھ چکے، اب مدرس کی باری ہے''۔ ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ جذبی صاحب کے ساتھ ہوئی تقدیم و تاخیر کی ناانصافی کی جانب تھا۔ خسرو صاحب نے ایک نگاہ درست انداز سے ان کی جانب دیکھا اور سب کچھ سمجھ کر مسکرا دیے۔

جذبی صاحب اگر چہ ڈکٹور ادب تھے، مگر انھیں اس بات سے چڑ تھی کہ کوئی انھیں ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرے۔ کسی نے ڈاکٹر صاحب کہا اور وہ ناخوش ہوئے، پھر بڑا مزا لے کر کہتے کہ ''ارے بھائی، نوکری کرنا تھی تو ایم۔ اے کے بعد پی ایچ۔ ڈی بھی کر لی۔ اس میں کون سا کمال ہے اور اس کا ادب یا شاعری سے کیا تعلق ہے''۔ جذبی صاحب کی بات درست تھی، جذبی تو یہ مشکل آٹھویں جماعت پاس تھے اور ایم۔ اے کے نصاب میں ہیں اور ان پر تحقیقی مقالے مسلسل لکھے جاتے ہیں۔

جذبی صاحب کے دو جملے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اکثر ہم جیسے نو واردان ادب کو تلقین کرتے کہ ''ادب کا تا اور لے دوڑی کا نام نہیں، اپنی تخلیق مکمل کر کے تکیے کے نیچے چھپا دو اور دنوں بعد نکال کر پڑھو تب فیصلہ کرو''۔ صراحتاً وہ مزید کہتے کہ ''روم بھی ایک دن میں نہیں بنا تھا، برسوں لگے تھے''۔

ایک بار انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک نوجوان شاعر، جنھیں جدیدیت بلکہ تجریدیت کا خبط تھا، ایک دن اپنا مجموعۂ کلام لے کر ان کے پاس آئے اور پڑھ کر رائے دینے کی استدعا کی۔ جذبی صاحب نے ان کی کتاب کا عنوان دیکھا، اس کے اوراق پلٹے اور پوچھا کہ ''بھئی اس عنوان کے معنی تو بتایئے''۔ ان صاحب نے سینہ تان کر کہا کہ ''ریگستان کی ایسی جھاڑی جسے اونٹ بھی نہیں کھاتا''۔ اس پر جذبی صاحب نے برجستہ کہا کہ ''میاں آپ نے ہمیں اونٹ سے بھی گیا گزرا سمجھا ہے؟'' ستم ظریفی یہ کہ بعد میں ان نا شاعر کا بڑا غلغلہ ہوا، ان پر انعامات و اکرامات کی بارش ہوئی، انھیں وہ سرکاری انعام بھی ملا جو غریب جذبی کو کبھی نصیب نہیں ہوا، مگر آج محض چالیس برس بعد کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا اور جذبی آج سو برس بعد بھی جذبی ہیں، ہمیشہ رہیں گے۔

جذبی صاحب کو اردو دنیا کے بیشتر انعامات و اعزازات ملے، ماسوا ایک دو سرکاری انعامات کے۔ ایک مرتبہ انھیں مرکزی حکومت کی جانب سے پدم شری کی پیش کش ہوئی تو انھوں نے سرکاری قاصد سے پوچھا کہ اس اعزاز یا خطاب کے ساتھ پیسے کتنے ملیں گے، جب جواب نفی میں ملا تو انھوں نے وہ اعزاز قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے جذبی کی طلب ثروت پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ پورے نظام پر ایک برجستہ طنز سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔

اپنی تمام تر شان استغنا کے باوجود ایک زمانے میں جذبی صاحب پر مکان بنوانے کا شوق سوار ہوا، شاید بیگم صاحبہ کے مسلسل اصرار پر۔ ان دنوں چہل قدمی اور چہل قدمی سب موقوف ہو گئی اور جذبی صاحب اپنے دوست، شاعر مکیش بدایونی کی قیادت میں صرف مکان سازی اور عمارتی ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف رہنے لگے۔ جذبی صاحب اس میدان میں نو وارد بلکہ نو سیکھیے تھے اور مکیش صاحب اس فن کے ماہر، کیوں کہ وہ ایک بلکہ نما مکان کے مکین تھے اور ان کے ارد گرد ان کے کئی مکان کرائے داروں کا مسکن تھے، حتیٰ کہ شاگرد پیشے بھی ذریعۂ آمدنی بن گئے تھے۔ ہم اکثر جذبی صاحب کو مکیش صاحب کے ساتھ کبھی جالی، کبھی کھڑکی جیسی غیر شاعرانہ اشیا کے ساتھ متوحش انداز میں رکشے میں لدے پھندے اور ساز و سامان کے بیچ پھنسے دیکھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے کہ اچھے بھلے شریف انسان اور شاعر اعظم کو یہ کیا دھن سوار ہوئی کہ اپنا محبوب مشغلہ شام کی سیر بھی قربان کیے، دھوپ ڈھائی میں مصروف

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

پروفیسر لطف الرحمٰن کی رحلت پر اردو گھر میں تعزیتی نشست

نئی دہلی (۳ر ستمبر)۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق اور بہار کے سابق ریاستی وزیر پروفیسر لطف الرحمٰن کا ۳۱ر اگست ۲۰۱۳ کو رات ساڑھے دس بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے بھاگلپور میں انتقال ہو گیا۔ یکم ستمبر کو بعد نماز مغرب ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی وفات پر آج انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی جس میں سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن ۱۹۴۱ء فروری ۱۹۴۱ کو دربھنگہ (بہار) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم اے اور پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ بھی رہے۔ بعد میں وہ حکومت بہار کے وزیر منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے بھی انھوں نے سماجی اور سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مزید کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے تقریباً ایک درجن کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں 'جدیدیت کی جمالیات'، 'نقد نگاہ' اور 'نثر کی شعریات' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بلاشبہ ان کے انتقال سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن بہت اچھے ادیب اور سماجی کارکن کے ساتھ ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ وہ ہمہ جہت اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دنیائے شعر و ادب کی بھی ایک ایسی مایہ ناز شخصیت تھی جن سے اردو کی ایک نسل مستفیض ہوتی رہی۔ ان کا بدل ملنا مشکل ہے۔ اس موقعے پر ہم انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔


پروفیسر لطف الرحمٰن

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے اچانک انتقال کی خبر ہم لوگوں پر بجلی کی طرح گری۔ وہ انتہائی لائق اور ہنرمند شخصیت کے مالک تھے۔ اردو، فارسی پر انھیں مکمل عبور تھا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بھی توانا اور تندرست تھے اور گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ وہ اچانک ہمارے بیچ سے اٹھ جائیں گے۔ ابھی تین روز پہلے ہی ٹیلی فون پر میری ان سے بات ہوئی تھی اور میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آپ دہلی کب تشریف لا رہے ہیں؟ تو انھوں نے یہ کہا کہ میں جلد ہی دہلی آنے والا ہوں۔ لیکن اچانک ہی یہ سب ہو گیا جس کا ہمیں بہت ملال ہے۔ وہ دانشوروں کی اس نسل میں تھے جو جدید اور قدیم کے درمیان ایک پل کا کام کرتی ہے۔ کسی ادبی معاشرے میں ایسی شخصیتوں کا وجود بہت غنیمت ہوتا ہے۔ اب سوائے صبر کے چارہ ہی کیا ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا ہو۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس تعزیتی نشست میں بہ ذریعہ فون خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کل اسلم پرویز مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے اور باتوں باتوں میں انھوں نے یہ بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے پٹنہ سے ٹیلی فون آیا تھا جس کے ذریعے پروفیسر لطف الرحمٰن کے انتقال کی جانکاہ خبر موصول ہوئی۔ وہ میرے مشفق اور کرم فرما تھے اور جب بھی دہلی آتے تھے تو مجھ سے ملتے تھے۔ میں نے اسلم پرویز صاحب سے یہ بھی کہا کہ مجھے ان کے اعزا کا پتا یا ٹیلی فون نمبر بتایئے تاکہ میں فوری طور پر ان سے تعزیت کر سکوں۔ اردو کا دامن ایسی نایاب شخصیتوں سے ایک ایک کر کے خالی ہو رہا ہے اور میں نہیں جانتا کہ آگے اس نقصان کی بھرپائی کیسے ہوگی؟ خدا انھیں غریق رحمت کرے اور ہم سب کو اس صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت دے۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی میں کافی عرصے تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ بلاشبہ ان کے انتقال سے ہم صف اول کے ایک ادیب، محقق اور ناقد سے محروم ہو گئے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن اردو کے بڑے اہم نقادوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ چند ایسے منتخب لوگوں میں تھے جنھوں نے ادب کے میدان میں نمایاں کام انجام دیے۔ وہ ہمارے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں حصہ لیتے تھے، ان کی شرکت اس لیے بہت اہم ہوتی تھی کہ وہ ہمیشہ نئے زاویے سے گفتگو کرتے تھے۔ بہار میں پروفیسر لطف الرحمٰن وزیر بھی رہے، انھوں نے وہاں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے غیر معمولی جد و جہد کی۔ ان کی بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ ان کے اچانک انتقال کا شدید افسوس تو ہے لیکن وہ اپنے غیر معمولی علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

اردو دُنیا

مہاراشٹر کے تمام اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی خالی اسامیوں پر تقرری کی جائے گی

ممبئی (۴ستمبر)۔ ریاست مہاراشٹر کے تمام اردو اسکولوں میں ٹیچروں کی خالی اسامیوں کو ایک ماہ کے اندر پُر کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ آج یہاں محکمہ اقلیتی بہبود اور محکمہ تعلیم کی اعلیٰ سطحی میٹنگ کے دوران لیا گیا جس کی صدارت ریاستی وزیر نسیم خاں نے کی اور اس میں وزیر تعلیم راجندر دردا بھی شامل تھے۔ ریاستی صدر دفتر منترالیہ میں منعقدہ اس میٹنگ میں نسیم خاں نے ریاست کے سرکاری اردو اسکولوں میں اساتذہ کرام کی خالی اسامیوں کا معاملہ اٹھایا اور کہا کہ اساتذہ کرام کی عدم دستیابی کی وجہ سے اردو اسکولوں کے طلبہ کا تعلیمی نقصان ہو رہا ہے نتیجتاً ان کا معیار تعلیم بھی گھٹ رہا ہے لہٰذا ان اسکولوں میں فوری طور پر ٹیچروں کی تقرری کی جائے۔ وزیر تعلیم راجندر دردا اور محکمہ تعلیم کے اعلا افسران نے اس موقع پر یقین دلایا کہ ایک ماہ کے اندر یہ تقرریاں کردی جائیں گی۔ دوران میٹنگ نسیم خاں نے اردو اساتذہ کرام کے سی ای ٹی کے امتحانات منعقد کیے جانے اور پھر ان کے نتائج نہ ظاہر کیے جانے پر بھی برہمی کا اظہار کیا جس پر یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ نتائج بھی ایک ماہ کے اندر ظاہر کردیے جائیں گے اور انھیں بھی نوکریاں فراہم کی جائیں گی۔

(ہمارا سماج۔دہلی)

دہلی حکومت نے سی ٹیٹ کی شرط ہٹا کر اردو اساتذہ کو راحت دی

نئی دہلی (۳۱اگست)۔ دہلی حکومت نے گیسٹ ٹیچر کی تقرری کے لیے سی ٹیٹ کی شرط کو ہٹالیا ہے۔ ان اساتذہ میں اردو کے اساتذہ بھی شامل ہیں۔ حکومت نے تمام مضامین سے اس شرط کو ہٹاکر بھی مضامین کے اساتذہ کو راحت دی ہے، لیکن سرو شکشا ابھیان کے تحت اردو کے اساتذہ کو ابھی راحت نہیں ملی ہے، جب کہ دہلی حکومت نے پندرہ روز قبل تین دن کے اندر اشتہار جاری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ امید کی جارہی ہے کہ گیسٹ ٹیچر پر سے بھی سی ٹیٹ کی شرط ہٹنے کے بعد سرو شکشا ابھیان کے تحت آنے والے اساتذہ کو بھی اس سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔ قابل ذکر ہے کہ دہلی میں اردو اساتذہ کی کل 262 پوسٹ ہیں جن میں سے 69 کا تقرر ہو چکا ہے اور اب باقی 193 اساتذہ کی تقرری کے لیے سی ٹیٹ کی شرط ہٹائی گئی ہے۔ فی الحال سی ٹیٹ والے تقریباً 120-25 اردو اساتذہ کی تقرری پہلے ہوگی اس کے بعد دیگر اساتذہ کا نمبر آئے گا۔ یکم ستمبر سے آن لائن رجسٹریشن شروع ہوگیا ہے اور ۹ ستمبر آخری تاریخ ہے اور ۱۰ ستمبر سے تقرری شروع کی جاسکتی ہے۔ حکومت کا یہ قدم دیر سے ہی سہی مگر درست قدم ہے۔ ۱۳ ستمبر کو اسکولوں میں پہلی سہ ماہی کے امتحانات ہونے ہیں۔ اردو اساتذہ کے نہ ہونے سے اردو پڑھنے والے طلبہ اردو کی تعلیم سے محروم رہ گئے ہیں۔ بڑی تعداد میں طلبہ نے اردو ٹیچر کے نہ ہونے کے سبب مجبوراً سنسکرت یا پنجابی لی ہے۔ گیسٹ ٹیچر کی تقرری کے بعد امید کی جارہی ہے کہ سرو شکشا ابھیان کے تحت آنے والے دیگر 200 اساتذہ کی راہ سی ٹیٹ ہٹا کر آسان کردی جائے گی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے بتایا کہ جن اساتذہ پر سی ٹیٹ کی شرط لاگو کی گئی ہے، دراصل وہ معاہدے کی بنیاد پر ہیں اس لیے ان پر سی ٹیٹ نافذ نہیں ہوتا۔ اب پہلی فرصت میں اردو اساتذہ درخواست دیں، کسی قسم کی کوتاہی یا سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ انھوں نے بتایا کہ 103 اسکولوں میں 200 اردو اساتذہ کی تقرری کی جانی ہے۔

(انقلاب۔دہلی)

اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی اشد ضرورت

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں مرکزی وزیر سلمان خورشید کا خطاب

نئی دہلی (۷ستمبر)۔ مرکزی وزیر خارجہ سلمان خورشید نے کہا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے معاشرے میں اردو کے فروغ، استعمال اور اس کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے اس لیے اردو کو تیز رفتاری کے ساتھ ماڈرن ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے وزیر خارجہ نے کہا کہ اردو ایک سیکولر زبان ہے، جس کی ترویج و اشاعت اور فروغ حکومت کی ذمہ داری ہے، یہی وجہ ہے کہ مرکزی حکومت نے اردو کونسل قائم کرکے اس کے فروغ کے لیے ایک جامع نظام تیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے این سی پی یو ایل نے قومی سطح کا جو نیٹ ورک قائم کیا ہے، اس سے تمام مذاہب کے بچے استفادہ کرتے ہیں اور اردو کی درس و تدریس کے توسط سے ایک سیکولر ماحول قائم ہوتا ہے جو قومی آہنگی میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سیکولر ذہنیت رکھنے والے تمام مذاہب کے لوگ اردو کی ترقی کے لیے اپنی اپنی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پلم راجو نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو سیکولرزم کی زبان ہے، جس کے تحفظ، بقا اور فروغ کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں اردو بولی جاتی ہے اور ہندوستان کی وحدت و سالمیت اور قومی ہم آہنگی میں بھی اردو کا اہم رول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے مقصد سے ہی حکومت ہند نے اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا ہے تاکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کو درپیش چیلنجوں کو پتا لگا کر ان کے حل کے لیے ٹھوس اقدام کیے جاسکیں۔ مسٹر پلم راجو نے کہا کہ اردو زبان کو شاعری، بالی ووڈ کی فلموں میں اچھے ڈائیلاگ، اچھے گانوں اور اردو جرنلزم میں جہاں زبردست اہمیت حاصل ہے وہیں پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ بات چیت اور مذاکرات میں بھی اردو زبان کا اہم رول ہوتا ہے، اس لیے مرکزی حکومت اردو کی ترویج و اشاعت، اس کے مزید فروغ اور اس کے نیٹ ورک کی توسیع کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گی اور اس کے لیے فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔

مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جتن پرساد نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی جنگ آزادی میں اردو زبان میں ہی نعرہ دیا گیا تھا جس کے پر جوش نعروں اور اس زبان کی قومی ہم آہنگی کے ماحول نے ہی زبردست جدوجہد کے بعد ہمیں آزادی دلائی۔ انھوں نے کہا کہ سہ روزہ کانفرنس کے نتائج سے ان کی وزارت کو واقف کرایا جائے تاکہ اردو کے فروغ کے لیے مزید اقدام کیے جاسکیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف وعدوں اور باتوں سے نہیں بلکہ عملی طور پر اردو کے فروغ کے لیے خلوص کے ساتھ کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ وزیر مملکت نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کی سمت میں بھی ان کی حکومت ہر ممکن اقدام کرے گی جس کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی مدد لے کر اس مقصد کو حاصل کیا جائے گا۔ قبل ازیں 'اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان' کے موضوع پر منعقدہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور نامور شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو ایک ایسے تہذیبی سفر کا نام ہے، جس نے کئی صدیوں تک ہندستانی ثقافت اور تہذیب کی بنیاد کو مضبوط کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان نے پوری دنیا کو ہندستانی ثقافت سے روشناس کرایا ہے۔

اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ ہندستان میں اردو کے لیے آج تاریخی دن ہے کیوں کہ حکومت ہند نے این سی پی یو ایل کے توسط سے ہندستان کی تاریخ میں پہلی عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا ہے، جو اردو کے فروغ کی سمت میں حکومت کی ایک بڑی کوشش ہے۔ اس سے قبل معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو کونسل اردو کی ترویج واشاعت کے میدان میں اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند نے یو پی ایس سی کے مقابلہ جاتی امتحانات سے عربی اور فارسی زبان کو ہٹانے کا غیر دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے، جس میں فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس میں دنیا کے پانچ براعظموں آسٹریلیا، امریکہ، یوروپ، افریقہ اور ایشیا کے ایک درجن سے زائد ملکوں کے اردو ادیب، نقاد اور شعرا شرکت کر رہے ہیں۔ آج کے اجلاس میں مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے سکریٹری اشوک ٹھاکر، جوائنٹ سکریٹری امیتا کمارا، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سوپوری کے علاوہ محبان اردو، کونسل کے اراکین، عملہ اور شرکا کی بڑی تعداد موجود تھی۔

(قومی سلامتی۔دہلی)

آر ٹی سی بسوں کے بورڈ پر اردو تحریر کے لیے نمائندگی

حیدرآباد (۲۶اگست)۔ تلنگانہ مائنارٹیز سیکولر فرنٹ کے ایک وفد نے قیوم اللہ شریف کی قیادت میں وائس چیئرمین اے پی ایس آر ٹی سی جناب اے۔ کے۔ خان سے شہر و اضلاع میں چلائی جانے والی آر ٹی سی بسوں کے بورڈس پر صرف تلگو کے استعمال کرنے پر تشویش کا اظہار کیا، حالاں کہ اردو زبان ریاست کے پندرہ اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے، اس کے باوجود شہر و اضلاع میں خاص کر منڈلوں تک چلائی جانے والی آر ٹی سی بسوں کے بورڈس پر اردو تحریر نہ ہونے کی وجہ سے اردو داں طبقے کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

(سیاست۔حیدرآباد)

جھارکھنڈ میں 4400 اردو اساتذہ کی تقرری کو منظوری

رانچی (۲۸اگست)۔ فروغ انسانی وسائل جھارکھنڈ کی وزیر گیتا شری نے اردو اساتذہ کے 4401 عہدوں پر تقرری کی منظوری دے دی ہے۔ انھوں نے ان عہدوں پر تقرری کے بعد تنخواہ کی رقم کو غیر منصوبہ بندی میں شامل کرنے پر اپنی اجازت فراہم کردی ہے۔ اب اس پر محکمہ خزانہ کی منظوری کے بعد کابینہ کی منظوری لی جائے گی۔ صدر راج میں ان عہدوں کی مدت بڑھانے کی تجویز پیش کی گئی تھی جس کے بعد گورنر کے اس وقت کے مشیر کے کے کھنہ نے اس کو غیر منصوبہ بندی میں شامل کرنے کی ہدایت دی تاکہ بار بار مدت میں توسیع کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ حکومت قائم ہونے کے بعد اس سلسلے میں تجویز بنا کر وزیر کے سامنے پیش کی گئی تھی، اب ان عہدوں پر تقرری ضلع سطح پر کمشنروں کی قیادت میں تشکیل کردہ کمیٹیوں کی طرف سے ٹی ای ٹی پاس امیدواروں سے ہوگی۔

(انقلاب۔دہلی)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

اصغر علی انجینئر مرحوم پر اداریہ اختصار نویسی کا بہترین نمونہ

مکرمی! 'ہماری زبان' کے ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۱۳ کے شمارے میں حضرت اصغر علی انجینئر سے متعلق آپ کا تعزیتی مضمون میں نے ایک بار نہیں، دو تین بار پڑھا تھا کیوں کہ یہ اختصار نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کردیا اور 'ہماری زبان' کے آدھے صفحے میں ان کی تمام خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بھرپور خراج عقیدت بھی پیش کردیا۔ یہ آپ کے قلم گہربار کا وصف ہے، کوئی دوسرا مدیر یہ سب لکھتے ہوئے زیادہ صفحات صرف کردیتا۔

(ڈاکٹر محمد طاؤس، نوئیڈا)

ڈی ایس سی ۲۰۱۳ میں اردو میڈیم ایس جی ٹی کی 1124 اسامیاں منظور

حیدرآباد کے لیے 189 اور ضلع میدک کے لیے 201 اسامیاں

سنگاریڈی (۲۳؍اگست)۔ مجوزہ ڈی ایس سی ۲۰۱۳ میں ضلع میدک کے لیے ایس جی ٹی اردو میڈیم کی 201 اسامیاں منظور کی گئی ہیں۔ اردو میڈیم کے لیے ضلع میں اتنی کثیر تعداد میں ایس جی ٹی اسامیوں کی منظوری ایک ریکارڈ ہے۔ ڈی ایس سی کا اعلامیہ تاحال جاری نہیں ہوا ہے لیکن اسامیوں کو مختص کرنے کا عمل مکمل کرلیا گیا ہے۔ اس دوران ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن نے ڈی ایس سی اعلامیہ کی اجرائی کے لیے درکار تمام تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ حکومت کی جانب سے اجازت کے فوری بعد اعلامیہ جاری کردیا جائے گا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق مجوزہ ڈی ایس سی میں ریاست بھر میں اردو میڈیم ایس جی ٹی کی جملہ 1245 اسامیاں منظور ہوئی ہیں۔ واضح رہے کہ ڈی ایس سی ۲۰۱۲ کے اعلان کے بعد جون میں ڈی ای اوز دفاتر سے خالی اسامیوں کی تفصیلات طلب کرلی گئی تھیں، جس کے بعد ڈی ای او ضلع میدک نے اپنی رپورٹ میں اردو میڈیم ایس جی ٹی کی 111 اسامیاں خالی ہونے کی نشان دہی کی۔ اس تعلق سے ضلع کے تلگو اخبارات میں خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی ضلع میدک کے اردو ٹریڈ ٹیچرس میں بے چینی پھیل گئی تھی کیوں کہ اردو میڈیم ایس جی ٹی کی 111 نہیں بلکہ 201 اسامیاں خالی ہیں۔ اس سلسلے میں فوراً اردو ٹریڈ ٹیچرس ایسوسی ایشن سنگاریڈی کے ذمہ داران نے او ایس ڈی جوائنٹ کلکٹر ضلع میدک سے رجوع کیا، بعد ازاں جناب ایم اے قادر فیصل رکن ایکزیکیٹو کونسل عثمانیہ یونیورسٹی کی قیادت میں ایک وفد وزیر ثانوی تعلیم، پرنسپل سکریٹری اسکول ایجوکیشن، کمشنر اینڈ ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن اور چیئرمین اقلیتی کمیشن سے نمائندگی کرتے ہوئے اس مسئلے کی یکسوئی پر زور دیا۔ ان کاوشوں کی بدولت ضلع میدک میں اردو میڈیم ایس جی ٹی کی 201 اسامیوں کی نشان دہی کے عمل کو منظوری دی گئی جس کی صراحت اسٹیٹ پروجکٹ ڈائرکٹر راجیو ودیا مشن کے مراسلے میں موجود ہے۔ اردو میڈیم ایس جی ٹی کی منظور شدہ اسامیوں کی تفصیلات اس طرح ہے: ضلع میدک کے لیے 201، حیدرآباد کے لیے 189، نظام آباد کے لیے 174، عادل آباد کے لیے 126، رنگاریڈی کے لیے 115، محبوب نگر کے لیے 84، چتور کے لیے 84، کریم نگر کے لیے 52، کرشنا کے لیے 37، نیلور کے لیے 18، کڑپہ کے لیے 37، اننت پور کے لیے 24، کرنول کے لیے 44، ورنگل کے لیے 11، کھمم کے لیے 3، نلگنڈہ کے لیے 16، گنٹور کے لیے 7، پرکاشم کے لیے 6، مشرقی گوداوری کے لیے 4، مغربی گوداوری کے لیے 4 اور ضلع وشاکھاپٹنم کے لیے 5 اسامیاں ہیں۔ اس طرح ریاست بھر میں سب سے زیادہ اردو میڈیم ایس جی ٹی کی اسامیاں ضلع میدک کے لیے منظور کی گئی ہیں۔ اسی دوران اسٹیٹ پروجکٹ ڈائرکٹر راجیو ودیا مشن آندھرا پردیش نے اردو میڈیم اسکولوں میں اکیڈمک انسٹرکٹرس کے تقررات کے احکام جاری کیے ہیں جس کے لیے بی ایڈ یا ڈی ایڈ تعلیمی قابلیت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ انھیں ماہانہ پانچ ہزار روپے تنخواہ دی جائے گی۔ اس ضمن میں ضلعی سطح پر کلکٹر، پروجکٹ آفیسر، ضلع اقلیتی بہبود عہدیدار اور ڈی ای او پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو اہل امیدواروں کا انتخاب و تقرر کرے گی۔ اکیڈمک انسٹرکٹرس کا تقرر صرف آٹھ ماہ کے لیے ہوگا اور ان کی میعاد ۳۱؍مارچ ۲۰۱۴ کو ختم ہوجائے گی۔ ڈی ایس سی کے انعقاد کے بعد اساتذہ کے تقررات عمل میں لائے جانے کی صورت میں اکیڈمک انسٹرکٹرس کو برخاست کردیا جائے گا۔ اردو مدارس میں اساتذہ کی کمی کے سبب تعلیم کو متاثر ہونے سے بچانے کے لیے اساتذہ، انجمنوں اور طلبہ کے سرپرستوں کی خواہش پر راجیو ودیا مشن نے یہ خصوصی اور عارضی انتظام کیے ہیں۔

(اعتماد، حیدرآباد)

اردو زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے اردو اخبار پڑھیں

ہم سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کسی طرح اردو کو بھی روزی روٹی سے جوڑا جائے

——وائس چانسلر

علی گڑھ (یکم ستمبر)۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایڈوانس اسٹڈی سینٹر کے زیر اہتمام لنگویج لیب کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ ہم سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کسی طرح اردو کو بھی روٹی اور روزی سے جوڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد سے انھوں نے اردو اخبارات پڑھنے شروع کیے جب کہ ان کے دل میں ہمیشہ سے اردو زبان سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے اردو اخبار پڑھیں اور خط و کتابت بھی اردو میں کریں۔

شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی چیئرمین شپ میں جو منصوبے بنائے وہ پورے ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کا شعبہ اردو دنیا کا سب سے بڑا شعبہ ہے اور اسی وجہ سے اردو دنیا کو اس شعبے سے بہت سی توقعات ہیں۔ پروفیسر محمد زاہد نے کہا کہ دور حاضر میں ترسیل و ابلاغ نے بہت ترقی کی ہے اور پوری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ لنگویج لیب طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ غیر ملکی طلبہ اس شعبے میں اردو سیکھنا چاہتے ہیں اس کے لیے قلیل مدتی کورس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ وائس چانسلر جنرل شاہ نے اردو کے نمبروں کو ڈومین میں جوڑنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ایک تاریخ ساز فیصلہ ہے جس کے بہت مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔

افتتاحیہ جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ لنگویج لیب کا افتتاح ایک اہم واقعہ ہے اور جن کی مادری زبان اردو ہے ان کو بھی اس لیب سے بہت فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ روس کے ایک شاعر کو جب نوبل انعام ملا تو اس نے کہا تھا کہ اچھا ایڈمنسٹریٹر وہی ہے جو ادب میں دل چسپی رکھتا ہو۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو ادب سے بہت زیادہ دل چسپی تھی اور وہ اس ملک کے سب سے عمدہ ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کو پڑھنے والا تہذیب اور انسانیت کے معنی سمجھتا ہے۔ ہم گزشتہ پچاس سال سے اردو کو لازمی طور پر پڑھانے کی کوشش کررہے تھے، اسے جنرل شاہ نے پورا کیا۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر سہیل احسن نے کہا کہ موجودہ وائس چانسلر نے اردو کی بقا کے لیے جو فیصلہ کیا ہے اس کے لیے ہم لوگ ذاتی طور پر ان کے ممنون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر طارق چھتاری اور ڈاکٹر اقبال صدیقی کی کوششوں سے یہ لیب وجود میں آیا ہے تاکہ اردو کے طالب علموں کو روزگار کے بہتر مواقع فراہم ہوسکیں۔

(انقلاب، دہلی)

اردو اساتذہ کے ایک وفد کی پروجکٹ ڈائرکٹر سے ملاقات

رہنما کتابیں اردو میں شائع کرنے کا مطالبہ

بنگلور (۲۳؍اگست)۔ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے محمد حسین دکھنی، اے اے شاہ اور نسرین بانو پر مشتمل ایک وفد نے اسٹیٹ پروجکٹ ڈائرکٹر (ایس ڈی پی) سرو شکشا ابھیان (ایس ایس اے) سے ملاقات کی اور ان سے شکایت کی کہ سی سی ای کی اور ریڈیو پروگرام کی رہنما کتابیں جو کنڑا میں چھپی ہوئی ہیں، اردو اساتذہ کے لیے اردو میں اب تک شائع نہیں کی گئی ہیں، اس سے اردو اساتذہ کو دقت اور دشواری ہورہی ہے۔ اس لیے اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے وفد نے ایس پی ڈی سے ملاقات کرکے ساتوں کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرکے جلد سے جلد شائع کرکے اساتذہ کو وقت پر مہیا کرانے کا مطالبہ کیا۔ ڈائرکٹر نے وفد سے مثبت گفت و شنید کی اور فوراً مذکورہ کتابوں کی اشاعت کے لیے فنڈ مہیا کرنے کا یقین دلایا۔

(سالار، بنگلور)

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور شاعر اور ماہنامہ 'روشن' کے مدیر جناب محمد خالد روشن خالد بدایونی کا ۵۸ سال کی عمر میں ۱۴؍اگست ۲۰۱۳ کو دہلی کے اسپتال میں دوران علاج انتقال ہوگیا۔ میت دہلی سے بدایوں لائی گئی جہاں ۱۵؍اگست کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ یہ اطلاع ہمیں جناب تسلیم غوری بدایونی نے دی ہے۔

خالد بدایونی کی پیدائش ۲۶؍اگست ۱۹۵۵ کو بدایوں کے مشہور تاجر حاجی محمد روشن (مالک سرکار بیڑی فیکٹری) کے گھر سرائے تج میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی اور پھر اپنے والد صاحب کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ ۱۹۷۰ میں ادبی ذوق پروان چڑھا، انھوں نے اپنے ادبی ذوق کی ابتدا شاعری سے کی اور اس وقت کے بدایوں کے جدید لب و لہجے کے استاد شاعر حضرت پیام نگرانوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوکر خالد تخلص اختیار کیا اور خوب نام کمایا۔ ۱۹۷۷ میں شاعری کا مجموعہ 'خوابوں کے محل' منظر عام پر آیا جس کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ اسی سال ماہنامہ 'روشن' کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے اور اس کے مدیر بنائے گئے۔ وہ مرحوم ڈاکٹر اسعد بدایونی کے رفیق کار تھے۔ ڈاکٹر اسعد بدایونی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ 'رہنمائی' کے نائب مدیر کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی۔ خالد بدایونی مرحوم اردو کے معروف اسکالر اور محقق ڈاکٹر شمس بدایونی کے بڑے بھائی تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

سرکاری اداروں میں اردو تختیاں نصب کی جائیں

حیدرآباد (۱۹؍اگست)۔ بے پال ریڈی (صدر ایسوسی ایشن سٹی سول کورٹ)، سید منصور احمد، محمد انور، رشید حبیب، سید یعقوب، محمد وسیم الدین اور محمد ذکی الدین قادری نے اپنے مشترکہ بیان میں چیف منسٹر آندھرا پردیش کرن کمار ریڈی اور چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائی کورٹ سے اپیل کیا ہے کہ تحت عدالتوں اور حکومت کے دیگر اداروں میں ساری تختیاں صرف انگریزی اور تلگو میں نصب ہیں جب کہ اردو کو نظر انداز کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے اردو جاننے والوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چیف منسٹر اس سلسلے میں ایک سرکلر جاری کریں کہ تلگو و انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی تختیاں آویزاں کی جائیں تاکہ ہر ایک کو سہولت ہوسکے۔

(منصف، حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : محمد ایوب واقف ایک مطالعہ
مصنف : ڈاکٹر سیفی سرونجی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۱۱۲ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
(deepak.budki@gmail.com)

سہ ماہی 'انتساب' کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی نے اردو ادب کو چالیس سے زائد تصانیف سے مالا مال کیا ہے اور 'انتساب' کی وساطت سے نامور قلم کاروں پر خصوصی شمارے اور گوشے مرتب کیے ہیں۔ ان کی ان تھک کوششوں اور اردو کی خدمات کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمہ جہت قلم کار محمد ایوب واقف کو وہ اپنا محسن مانتے ہیں اس لیے نہ صرف ان پر 'انتساب' کا ایک ضخیم خصوصی شمارہ نکال چکے ہیں بلکہ زیر نظر کتاب سے پہلے بھی ایک کتاب 'محمد ایوب واقف۔شخصیت اور فن' کے عنوان سے شائع کر چکے ہیں۔ چناں چہ ان دونوں کی اشاعت کے بعد واقف کی کئی نگارشات منصۂ شہود پر آئیں اور مشاہیر ادب کے کئی خطوط سیفی سرونجی کو موصول ہوئے جن سے ان کی شخصیت اور فن پر مزید روشنی پڑی اس لیے زیر نظر تصنیف کا شائع ہونا ناگزیر بن گیا۔

کتاب کی ابتدا میں محمد ایوب واقف کا شجرۂ نسب درج کیا گیا ہے۔ پورہ نورم بیسان، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے محمد ایوب واقف کا ادبی حلقہ بہت وسیع ہے اور اردو کے نامور شاعر و ادیب ان سے خط و کتابت کرتے رہے ہیں۔ بہ قول سیفی سرونجی وہ دین داری، حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے لیے جانے جاتے ہیں مگر خود نمائی اور خود تشہیر سے گریز کرتے ہیں۔ محمد ایوب واقف نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا مگر بعد میں تحقیق اور تنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بہ قول ڈاکٹر سرونجی ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور اس حوالے سے انھوں نے اپنی کتاب میں کئی ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اب تک ایوب واقف کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں: جگن ناتھ آزاد۔ایک مطالعہ، مکاتیب نجم، علی سردار جعفری کی شاعری، ذکر رفتگاں، شعور و ادراک، میں زندہ ہوں، تعبیر و تشریح اور پارۂ ایک منظوم افسانہ۔ علاوہ ازیں انھوں نے بے شمار مضامین، مقالے، انٹرویو اور ریڈیو کے لیے تقریریں قلم بند کیے ہیں۔ نظم 'میرا گاؤں' میں واقف کا تخیل سر چڑھ کر بولتا ہے۔ فرماتے ہیں:

جب بھی اپنے گاؤں کا مجھ کو خیال آتا ہے
پھر ایسے لگنے لگتا ہے
کل ہی تو اس کو چھوڑا ہے
اتنے سال کہاں سے گذرے!!!

محمد ایوب واقف نے جو کچھ بھی لکھا سوچ سمجھ کر اور گہرے مطالعے و مشاہدے کے بعد لکھا ہے۔ انھوں نے جہاں کئی نامور ہستیوں جیسے جگن ناتھ آزاد، دیا نارائن نگم، گوپی چند نارنگ، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس اور قرۃ العین حیدر وغیرہ پر مضامین تحریر کیے وہیں انھوں نے ادبی موضوعات پر بھی فکر انگیز مضامین قلم بند کیے۔ شخصیت نگاری کے بارے میں خود ایوب واقف فرماتے ہیں کہ "بے لاگ حقیقت نگاری کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ جس شخصیت کی مرقع کشی کی جا رہی ہے اس کو اس درجہ غلیظ اور پراگندہ کر دیا جائے کہ لوگ تھو تھو کرنے لگیں، ہمارے ادب میں اس نوع کا تصور اور اس ڈھنگ کی شخصیت نگاری غیر صحت مند ذہنوں کی پیداوار ہے"۔ البتہ ایسا نہیں ہے کہ ایوب واقف نے ہر شخص کی تعریف ہی کی ہے بلکہ جہاں ضروری سمجھا وہاں اس کے فن کی نکتہ چینی بھی کی ہے۔ نظریاتی تضاد کے سبب انھوں نے اپنے خطوط میں سردار جعفری سے کئی سوالات بھی کیے۔ سیفی سرونجی نے زیر نظر کتاب میں ایوب واقف کی مختلف تصانیف کا مختصر جائزہ لیا ہے اور ان پر مشاہیر کے اہم تاثرات بھی درج کیے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں پبلسٹی اور نیٹ ورکنگ ہی سے آدمی ترقی کے زینے طے کر پاتا ہے مگر آج بھی کچھ جیالے ایسے ہیں جو ان حربوں سے اجتناب کرتے ہیں اور خاموشی سے اردو ادب کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔ انھی لوگوں میں محمد ایوب واقف بھی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ زیر نظر کتاب ان کی شخصیت اور فن پر نہ صرف ایک اہم دستاویز ہے بلکہ اردو ادب کے تئیں ان کی بے لوث خدمت کا اعتراف بھی ہے۔

●◆●

نام کتاب : جھارکھنڈ کی اردو کتابوں کا اشاریہ (جلد اول)
مرتب : ڈاکٹر سرور ساجد
ضخامت : ۸۰۷ صفحات
قیمت : ۴۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : سرور ساجد، نظیر خاں لین، مین روڈ، رانچی-R34001
تبصرہ نگار : ایم رحمٰن (دہلی)

افسوس کا مقام ہے کہ آج ادب کی دنیا میں ورنے کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے اور پانے کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ لیکن جو لوگ ادب کی دنیا میں محنت کرتے ہیں، دیانت دار ہیں۔ انھیں ادبی بصیرت سے خدا بہتر مالا مال کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر سرور ساجد کا شمار ہوتا ہے۔ جھارکھنڈ کی تاریخ میں اشاریہ کے توسط سے اُن کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ آدمی کے سامنے ایک سوچا سمجھا نشانہ (Target) ہو، جس کی صداقت پر اس کا ذہن مطمئن ہو، جب اس کے اندر مقصدیت آجائے تو اس کی زندگی لازماً ایک اور زندگی بن جائے گی اور جب آدمی کے اندر کسی کام کے کرنے کی لگن ہو تو اس کام کو وہ ہر حال میں کر ڈالتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر سرور ساجد (غلام سرور خاں) نے 'جھارکھنڈ کی اردو کتابوں کا اشاریہ' مرتب کر کے ایک اہم علمی کام انجام دیا۔ اس میں 81 کتابوں کی تفصیلات شامل ہیں۔ اشاریہ کا کام کوئی سہل بھی تو نہیں کہ قلم اٹھایا اور کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آ گئی، یہاں تو صبح و شام تاریخ کی گود میں بیٹھ کر جھکولے کھانے پڑتے ہیں تب مستند و معتبر اشاریہ وجود میں آتا ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

تمام عمر قلم کے سفر میں رہتا ہے
عجیب خواب ہے کاغذ کے گھر میں رہتا ہے

کتاب کے مقدمے میں سرور ساجد رقم طراز ہیں:

"ادبی تاریخ کی تحقیق و تدوین ایک جانکاہ مسئلہ ہے اور اس کی متعدد شقیں ہیں جن میں سے ایک اہم شق اشاریہ سازی بھی ہے۔ اشاریہ سازی کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں مثلاً کسی مصنف کی تمام تصانیف اور تخلیقات جو کہ رسائل میں بکھری پڑی ہوں، ان کا اشاریہ بھی ترتیب دیا جا سکتا ہے اور یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ مصنفین کی تخلیقات کا اشاریہ ترتیب دیا جائے۔ گویا اشاریہ سازی کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ چوں کہ جھارکھنڈ سے شائع ہونے والی کتابوں کا اب سے پہلے کوئی اشاریہ کسی نے تیار نہیں کیا، بقول ش اختر جھارکھنڈ میں اردو کا سلسلہ پچھلے چار سو برسوں پر پھیلا ہوا ہے"۔

اس کتاب کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوگا کہ جھارکھنڈ کا اردو شعر و ادب ہندستان کے ہر خطے کے ادب سے آنکھیں ملانے کی جرأت رکھتا ہے۔ میری نظر میں 'جھارکھنڈ کی اردو کتابوں کا اشاریہ' ایک ایسا علمی کام ہے جسے جھارکھنڈ کی سرزمین پر پہلی دفعہ ڈاکٹر سرور ساجد نے انجام دیا ہے۔ مصنف کی کوشش ہے کہ ۱۹۴۷ سے تا حال اردو زبان میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اس کی فہرست تقریباً ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے، کئی جلدوں میں اشاریہ سازی منظر عام پر آئے۔

ڈاکٹر سرور ساجد کے ادبی سفر میں اس سے پہلے متعدد تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں جنھیں غیر معمولی پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے، چند کتابوں کے نام ہیں: کاغذی پیرہن، ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ، مٹی بھر غزلیں (ہندی)، منتخب غزلیں، اردو کے ۹۷ منتخب اشعار (اردو ہندی)، رات کے روپ بہت، دل مضطرب سلامت، سرو سن۔

اس کتاب (اشاریہ) کی طباعت عمدہ ہے۔ ریسرچ کے طلبا اور شخصیات و تکشن پر کام کرنے والوں کے لیے یقیناً یہ کتاب گائڈ کا کام کرے گی۔ امید کہ ڈاکٹر سرور ساجد کے اس اشاریہ کی پذیرائی ہوگی اور علم دوست حضرات اس کتاب کا مطالعہ ضروری سمجھیں گے۔ میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انھیں اس اہم کام پر مبارک باد دیتا ہوں۔

●◆●

بقیہ: عہد حاضر کا ایک اہم اقبال شناس

صفحہ ۸ سے آگے

مماثلتیں جو اتفاقی ہیں یا مخصوص حالات کے پیش نظر وجود میں آئیں۔ فاروقی کے مطابق حسب ذیل ہیں:

1- ان تینوں کو فاشسٹ نواز کہا گیا۔ اقبال پر نطشے کا اثر، شاہین اور خودی کے نظریات، مسولینی کی ستائش، ان سب میں فسطائیت کی کارفرمائی نظر آئی۔ ایلیٹ کو اس کے خطوط کے ذریعے فاشسٹ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ یے ٹس کے افکار کا ماخذ نطشے اور فسطائیت کو قرار دیا گیا۔

2- تینوں کو اس کا شدید احساس تھا کہ وہ اپنے سماج میں غیر ہیں۔ یے ٹس اپنا تشخص قدیم آئرلینڈ میں ڈھونڈتا تھا لیکن پروٹسٹنٹ ہونے کی وجہ سے وہ وہاں کی کیتھولک روایات سے بالکل منقطع تھا۔ ایلیٹ امریکہ کے جنوب بعید کا پروردہ تھا۔ انگلستان میں اس نے کیتھولک ہونے کا اظہار کیا، ان دنوں وہاں مذہب سے بہانے نام دل چسپی تھی۔ ایسے حالات میں ایلیٹ کو مخالفت و معاندت کا سامنا کرنا پڑا۔ فلسفۂ خالص سے دل چسپی کی وجہ سے اقبال عام مسلمانوں سے الگ نظر آتے ہیں۔ وہ دوسرے مسلمانوں سے اس طرح بھی ممتاز ہو جاتے ہیں کہ ان پر فلسفہ حاوی نہیں ہوتا اور اس سے ان کو کوئی خطرہ نہ تھا، جب کہ عام مسلمانوں کو فلسفہ گمراہ کر دیتا تھا۔ اقبال کو اس کا احساس بھی تھا، ان کا یہ احساس ان کے ان اشعار میں جھلکتا ہے:

میں اصل کا خاص سومناتی
میرے آبا لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کف خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

3- اسراری علوم اور قدیم ہندستانی فلسفے سے ان تینوں شعرا کو دل چسپی تھی۔

4- یہ تینوں مذہب سے متاثر تھے۔

5- ان تینوں کے نزدیک سیاست شجرۂ ممنوعہ نہ تھی، ان کے یہاں سیاست کی ریاست عام زندگی سے آگے بڑھ کر تخلیقی دائرے میں داخل ہو

چکی تھی۔ بے ٹس اور اقبال عملی سیاست میں بھی سرگرم تھے۔ ایلیٹ اگرچہ عملی سیاست کے میدان کا آدمی نہ تھا لیکن سیاسی مسائل سے اس کو گہری دلچسپی تھی۔

مندرجہ بالا مماثلتوں کے علاوہ فاروقی ان شعرا کے درمیان نقطۂ اشتراک ان کی تکثیری سرگرمی کو قرار دیتے ہیں۔ یہ شعرا مختلف مذاہب و روایات کے حامل ہیں اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن افکار کی راہ سے وہ گزرتے ہیں ان سب کے ڈانڈے ایک جگہ جا کر مل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ہی طرح کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں بھی مماثلت ہے انسان، کائنات، خدا، موت اور وقت۔

وقت اور زماں کے سلسلے میں یے ٹس، اقبال اور ایلیٹ کے تصورات میں کس طرح کی مماثلت ہے فاروقی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"یے ٹس نے وقت کے مسائل پر براہ راست اظہار خیال نہیں کیا ہے، لیکن حیات و موت کی وحدت کے تصور کی بنا پر اس مسئلے کو کہیں نہ کہیں جھلک اٹھتی ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ 'مجھے یقین ہے کہ مردہ لوگ جو اپنے حافظے میں زندہ رہتے ہیں، اس تمام قوت کا سرچشمہ ہیں جسے ہم جبلت کہتے ہیں'۔ اس زندہ + مردہ وجود کو یے ٹس anima mundi یعنی جان جہاں کا نام دیتا ہے۔ ڈاگیو اور Ellman دونوں کا خیال ہے کہ اس جان جہاں کا تصور یے ٹس کی نگاہ میں کسی ایسی قوت کا بھی تھا جو پیکروں اور علامتوں کا خزینہ ہونے کے علاوہ کسی نسل یا قوم کے خوابوں اور یادوں کا بھی مرتع و مخزن تھی۔ یہ خواب اور یادیں گرم کار ہیں اور بھی بھی شاعر انھیں علامات کے ذریعے متشکل بھی کرسکتا ہے۔

ہماری آپ کی نظر میں یہ تصورات اگرچہ مضحکہ خیز نہیں تو مہمل ضرور ہوں گے۔ اب اسے کیا کیا جائے کہ اپنے خیال میں انھی تصورات کو کام میں لا کر یے ٹس نے واقعی بڑی شاعری بھی کی ہے لیکن اصل نکتہ یہ ہے کہ anima mundi کے یہ تصورات حقیقتاً وقت کی الوہیت کی دلیل ہیں۔

وقت کبھی مرتا نہیں، گذرتا نہیں، کوئی چیز وقت سے خالی نہیں ہے۔ اگر ہر چیز کا پیمانہ بھی وقت ہے اور اس کا ملجا و مرتع و مخرج بھی وقت ہی ہے۔ تو پھر وقت یا تو خدا کی طرح قدیم یعنی خدا کی ایک صفت یا پھر وہ خود خدا ہے۔ اگر وقت ہر چیز کا مخرج و منبع نہ ہوتا تو مرنے والوں کے افکار اور ان کے حافظے بھی مر جاتے۔ لیکن چونکہ یے ٹس کے خیال میں مرنے والوں کے حافظے زندہ ہیں۔ اس لیے وہ وقت میں محفوظ ہیں۔ اسی لیے یے ٹس کا خیال ہے کہ خالص فن بھی Temporal time سے ماورا ہے اور اصل وقت میں محفوظ ہو کر وہ ماضی، حال، مستقبل سب کو محیط ہو جاتا ہے ...

اقبال اور ایلیٹ وقت کی تسخیر نہیں کرتے۔ اقبال کا تالہ زماں کا تصور اسلامی نقطۂ نظر سے غلط تھا یا صحیح، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ شبیر احمد خاں غوری نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ تالہ زماں کا نظریہ اسلامی نہیں ہے لیکن اقبال اس غلط فہمی کی بنا پر جو حدیث لا تسبوا الدھر کی تفسیر کے سلسلے میں عام ہے، اسے اسلامی سمجھتے تھے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اقبال 'وقت' کو اللہ کے اسمائے صفات میں سے فرض کرتے ہیں لہٰذا وقت پر حاوی ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن وقت حوادث و افکار کا سرچشمہ ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ وقت قدیم بھی ہے اور کائنات کے مختلف عوامل کی آماجگاہ بھی۔ یہ تصور یے ٹس سے ذرا مختلف ہے، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر دکھایا ہے مردہ + زندہ کا پیکر جو یے ٹس فرض کرتا ہے اس میں وقت کی الوہیت کا تصور موجود ہے۔ اقبال کے یہاں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

اقبال کا یہ تصور اتنا مشہور ہے کہ اس کی اور مثالیں فراہم کرنا غیر ضروری ہے۔ اقبال ہی کی طرح ایلیٹ بھی وقت کی تسخیر کے نظریے سے بیگانہ ہے۔ وہ اگر تالہ زماں کا کھل کر قائل نہیں ہے تو اس کو اپنا محکوم بھی نہیں سمجھتا۔ بلکہ کسی نہ کسی نہج سے وقت کو مسلسل اور خود کو اس تسلسل میں گرفتار ضرور پاتا ہے۔ وقت کا تسلسل یعنی وقت بطور ایک Continuum اقبال کا محبوب موضوع ہے"۔ ؎

اپنے مضمون کے اس موڑ پر آکر مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آئندہ جو اقتباسات میں فاروقی کی تحریر سے پیش کروں گا وہ بادی النظر میں کچھ زیادہ طویل معلوم ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فاروقی کا استدلال اتنا گٹھا ہوا اور ان کی تحریر اتنی پرمغز ہوتی ہے کہ ان کے ایک دو جملے نقل کر کے ان کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ بقول چودھری محمد نعیم، فاروقی کا ایک ایک لفظ محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بات انھوں نے ایک پاکستانی رسالے میں اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے ضمن میں بیان کی تھی کہ اور نقادوں کی تلخیص سے بھی کام چل جاتا ہے، لیکن فاروقی کی تحریر اس طرح منجھی ہوئی اور منضبط ہوتی ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی بات فاروقی کی تحریر سے اقتباسات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: ہم قدم جذبی صاحب کی یاد میں

صفحہ ۳ سے آگے

ہیں۔ وہ شاید منٹو کے اس قول سے متفق نہیں تھے کہ بے وقوف مکان بناتے ہیں اور عقل مند اس میں رہتے ہیں۔ خیر جذبی صاحب کا مکان بنا اور خوب شاندار بنا۔ سبکدوشی کے بعد وہ اس میں منتقل ہو گئے تھے اور آج وہ ان کے ورثا کے تصرف میں ہے۔

غلط بخشی ہمارے ملک اور معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے اور علی گڑھ اس کا ایک اہم مرکز۔ جذبی صاحب اپنی تمام تر شاعرانہ عظمت، شہرت و مقبولیت کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر نہ ہو سکے۔ ہرچند کہ اس وقت تک پروفیسری کی وہ درگت اور خواری نہیں ہوئی تھی جو آج ہے اور نہ ہی یہ منصب اتنا ارزاں ہوا تھا، جیسا کہ اب ہے، مگر اتنا گراں بھی نہ تھا کہ جذبی جیسے عالم، فاضل اور لائق استاد کی دستار کا سرخابی پَر نہ بن سکتا۔ لیکن جذبی صاحب کو نہ صرف مسترد کیا گیا بلکہ جن صاحب کو یہ منصب تفویض ہوا وہ جذبی کے ہم پلہ تو کیا ان کا پاسنگ بھی نہ تھے، ان کی شاعری تو خیر برسبیل تذکرہ تھی اور ان کی لیاقت و شہرت کا دار و مدار محض ایک مضمون پر تھا، جو انھوں نے اوائل عمری میں لکھا تھا اور پھر وہیں ٹھہر گئے تھے، آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ مگر وہ نہ صرف پروفیسری پر قابض ہوئے بلکہ کرسی صدارت شعبہ پر بھی براجمان ہوئے۔ جذبی صاحب نے اس کے بعد جیسے تیسے اپنا وقت پورا کیا اور کبھی اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے والے کی شکل نہیں دیکھی۔ خسرو صاحب جو اس وقت تک جذبی کے مداح ہو چکے تھے، انھوں نے اس حق تلفی کا ازالہ ان کی خدمات کو توسیع دے کر کیا اور یہ سب کچھ بلاشرط اور آزادانہ تھا۔

جذبی صاحب عام طور پر اساتذہ کے علاوہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے ہم عصروں کو تو قطعاً نہیں۔ غالب اور اقبال کے احترام کے باوصف ان کا پسندیدہ شاعر کون تھا، مولانا الطاف حسین حالی۔ وہ اکثر ان کا ایک شعر زیر لب گنگنایا کرتے تھے۔

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

یہ شعر شاید ان کے احساس محرومی کی ترجمانی بھی کرتا تھا، ممکن ہے کہ انھیں یہ احساس رہا ہو کہ انھیں ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ سزاوار تھے، بہرکیف نقادوں نے انھیں ان کا جائز مقام دیا ہو یا نہ دیا ہو، لیکن ان کی شاعری، ان کی لازوال شہرت کی ضامن ہے، وہ اکثر کہتے بھی تھے کہ "میری شاعری کے پاؤں ہیں، جن سے وہ چلتی ہے اور چلے گی، اسے کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں"۔ بیسویں صدی کی شعری روایت جن چند ناموران سخن سے عبارت ہے اُن میں ایک روشن اور تابناک نام معین احسن جذبی کا ہے۔ وہ ترقی پسند بھی ہیں، رومانیت پرست بھی، مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھے اور بڑے شاعر ہیں، ان کے چند شعر بہتوں کے دواوین پر بھاری ہیں اور یہی وصف انھیں جاوید بناتا ہے۔

(پس نوشت: ۲۱ راگست ۲۰۱۳ کو جذبی صاحب کی پیدائش کی ایک صدی تمام ہوئی، ان کا مرتبہ و مقام اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی صدی کو ان کے شایان شان منایا جائے)۔

●●●

عہدِ حاضر کا ایک اہم اقبال شناس

(پہلی قسط)

محمد صہیب (156B/9B/1، شمس نگر، کریلا باغ، الہ آباد)

اقبال شناسی بلاشبہ وقت، نظر، عمیق مطالعے اور تبحر علمی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اقبال کی حیات میں ہی یہ کوشش شروع ہو گئی تھی۔ جید علما اور ناقدین اقبال کے کلام کے اسرار و رموز کی تہ تک پہنچنے کی سعی کرتے رہے ہیں، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اقبال شناسوں میں خلیفہ عبدالحکیم، عالم خوند میری، ڈاکٹر عابد حسین، ای میری شیمل اور پروفیسر نکلسن کے نام خصوصیت سے لیے جاتے ہیں۔ یوں تو سب سے بڑے اقبال شناس کا نام راقم الحروف کی نظر میں ہمالہ ہے جو اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ سربلند ہے، جس کی پیشانی کو جھک کر آسمان بوسہ دیتا ہے اور جو صحیح معنوں میں یہ بتاتا ہے کہ اقبال کی شاعری ہمالہ کی طرح عظیم اور فلک مرتبت ہے۔

طالب علم ہر بڑے ادیب و شاعر کے کلام کو سمجھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام کی اتنی جہتیں ہیں کہ ان کی تفہیم کے لیے وہ معیار نہیں طے کر پاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مقصود موہوم ہو جاتا ہے اور طالب علم کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کس زاویے سے کیا جائے۔ اقبال پر جن لوگوں نے قلم اٹھایا انھوں نے اپنے اپنے ظرف اور وسعت مطالعہ کے مطابق کلام اقبال کے مفاہیم کے ادراک کی کوشش کی اور اقبال کی عظمت و فضیلت کے سراغ تلاش کیے۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جو لوگ واقعی علمی بصیرت کے حامل تھے یا ہیں انھوں نے مستقل کر اقبال کے سلسلے میں صرف انھی موضوعات کا انتخاب کیا، جن پر ان کی گہری نظر تھی اور جن کے بارے میں وہ لکھنے کے اہل تھے۔ ایسے نقادوں میں شمس الرحمن فاروقی کا نام صف اول کے اقبال شناسوں میں لیا جا سکتا ہے۔

اقبال سے شمس الرحمن فاروقی کو جو مناسبت اور انس ہے اس کے پس منظر میں ان کے والد مرحوم کی توجہات ہیں۔ اقبال سے غیر معمولی دلچسپی کے باعث فاروقی کے والد نے فاروقی کو لڑکپن کے ہی زمانے سے اقبال کی طرف متوجہ کیا اور اقبال کے اشعار کے مطالعے کی ترغیب دی اور ان کے شوق کو مہمیز کیا۔ فاروقی اقبال سے ویسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسا کہ ان کو اپنے والد سے تھی۔ اور اقبال پر وہ اسی طرح اپنا حق سمجھتے ہیں جس طرح کا حق وہ اپنے والد پر سمجھتے تھے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے اشعار نے انھیں ناامیدی سے بچا لیا اور صحیح مصرف پر لگا دیا اور زندگی کا احساس ان کے اندر جگا دیا۔ فاروقی کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"اقبال نے وقتاً فوقتاً مجھے یاس اور بے مصرفی کے گڑھوں میں غرق ہونے سے بچا لیا اور اس کی وجہ ان کا 'پیغام' نہیں بلکہ ان کی شاعری تھی۔

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

میں انھیں جتنی بار پڑھتا ہوں مجھے یہ اشعار ہر بار ایک نئی لذت، ایک نیا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ ہر بار یہ اشعار اپنی روانی، موسیقیت، بلند لیکن دردمندی سے معمور آہنگ، نئے اور نامانوس لفظوں کو انجانوں کی سطح سے اٹھا کر ابال اور انجذاب کی سطح پر لے آنے کی قوت کے باعث مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں خود کو زندہ سمجھوں اور اس قوت مند، تقریباً الہامی زبان کا زندہ شریک سمجھوں جس میں اس طرح کے شعر ممکن ہو سکتے ہیں۔"

فاروقی اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور ان کو ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ جب بھی انھیں کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو اقبال ان کو صحیح حل بتائیں گے۔ اقبال کی نظم 'جمعیت اقوام' سے انھوں نے مغربی سیاست کے بارے میں بصیرت حاصل کی۔ فاروقی کے یہاں اقبال سے محبت کا صرف دعویٰ ہی نہیں ہے کہ اقبال کو مقدس پتھر سمجھ کر بوسہ دیا اور چھوڑ دیا، بلکہ عملی طور پر اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ جب اس رخ سے فاروقی کے سرمایۂ ادب کی چھان پھٹک کی گئی تو اقبالیات پر ایک بیش بہا خزانہ دستیاب ہوا۔ اقبال پر فاروقی کے مضامین حسب ذیل ہیں:

1- ییٹس، اقبال اور الیٹ
2- آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، غالب اور اقبال
3- اقبال کا لفظیاتی نظام
4- اقبال کا عروضی نظام
5- تفہیم اقبال (ریڈیو پر صدا بند گفتگو)
6- اقبال کے حق میں رد عمل
7- اردو غزل کی روایت اور اقبال
8- اقبال کا اقبال

ان کے علاوہ کم و بیش اتنی ہی تعداد میں فاروقی نے اقبال پر انگریزی میں بھی مضامین لکھے ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ پروفیسر علی احمد فاطمی اور ان جیسے حضرات فاروقی کے سلسلے میں غلط فہمی کے شکار ہوئے کہ ان کو اقبال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ان کی ادبی سرگرمیوں میں اقبال کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پروفیسر فاطمی نے تو فاروقی سے بازپرس تک کر لی کہ اقبال پر انھوں نے کیوں نہیں لکھا اور بزعم خود فاروقی کے احاطۂ نظر میں اقبال کے نہ ہونے کی علت بھی تلاش کر لی کہ مقصدیت، افادیت، تاریخیت، خطابت اور پیامیت فاروقی کی شریعت سے باہر کی چیز ہیں۔ اس پر انھوں نے اکتفا نہیں کی فاروقی کو تلقین بھی کی کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی عناصر (مقصدیت، افادیت، تاریخیت، خطابت، پیامیت) دنیا کی ہر بڑی شاعری کی تشکیل کرتے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر فاطمی کا یہ مضمون 'نظر و نظر' کے نومبر 2003 کے شمارے میں شائع ہوا، جب کہ اس سے چار دہائی پہلے 1962 کے آس پاس اقبال پر فاروقی کا مضمون 'آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، غالب اور اقبال' علی گڑھ کے اسی رسالے 'نظر و نظر' میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکا تھا۔

اسی طرح کی اور بھی کئی تحریریں نظر سے گزریں۔ مثلاً ماہ نامہ معارف بابت اکتوبر 2012 کے شمارے میں جناب سید عبدالباری (شبنم سبحانی) نے فرمایا ہے کہ فاروقی نے اقبال پر کچھ لکھا ہی نہیں۔ اور فاروقی کو اقبال پر کچھ لکھ کر اپنی آبرو بچانے تک کا مشورہ دیا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ فاروقی کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے کہ انھوں نے اقبال پر کیا لکھا ہے اور ان کی تنقیدی نگاہ اقبال کو کس زاویے سے دیکھتی ہے۔

فاروقی کی نگاہ نہ صرف اردو، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب پر ہے بلکہ ادبیات عالم ان کے احاطۂ فکر میں ہے۔ اپنے اسی مطالعے کے زیر اثر انھوں نے اقبال کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اور نئی جہتوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اقبال اور بعض بڑے مفکرین اور شعرا کے درمیان مشابہتوں اور مماثلتوں کی بھی فاروقی نے نشاندہی کی اور ان مماثلتوں کے پس منظر میں کس طرح کے عوامل کارفرما تھے ان کو بھی بیان کیا۔ 'ییٹس، اقبال اور الیٹ' کے عنوان سے فاروقی نے باقاعدہ ایک مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں ییٹس، اقبال اور الیٹ کے درمیان مماثلت کی چند جہتوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ وہ ان تینوں شعرا کو اسراری (Mystic) خیال کرتے ہیں، لیکن ایسا قطعاً نہیں ہے کہ وہ ان تینوں کو ایک ہی درجے کا شاعر سمجھتے ہیں یا ان کے افکار ایک جیسے ہیں یا ان کے پس منظر میں مشترک عوامل کارفرما ہیں۔ فاروقی صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ:

"نسل، زبان اور تہذیب کے اختلاف کے باوصف ان تینوں نے حیات و کائنات کے بعض مخصوص مسائل کو چھیڑا ہے اور ان مسائل کی طرف ان کا رویہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے۔"

ان تینوں شعرا کے درمیان ظاہری (بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax:011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org